فیلسوف العرب - الکندی

طفیل احمد قریشی - ایم - اے

ابو یوسف یعقوب الکندی کا تعلق جنوبی عرب کے کندہ قبیلے کے اس گھرانے سے ہے جس کے حصے میں ہمیشہ سرداری رہی۔ لوگ اس کے گھرانے کے افراد کو بڑی عزت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے اس کے جد امجد اشعث بن قیس کو صحابی رسول ہونے کا شرف بھی حاصل ہے[1]

القفطی اپنی کتاب "تاریخ الحکما" میں لکھتا ہے۔ اشعث قبیلہ کندہ کا حکمراں تھا۔ اور اس کا والد قیس بن معدی کرب بھی کندہ کے حکمراں رہ چکا تھا۔ اور یہ قیس وہی ہے، جس کی تعریف میں عرب جاہلی کے مشہور شاعر اعشیٰ نے چار لمبے لمبے قصیدے لکھے تھے[2]

الکندی کے والد اسحاق بن الصباح عباسی خلیفہ مہدی (۷۷۵ - ۸۵ھ) اور ہارون الرشید (۷۸۶ - ۸۰۹ء) کے دور میں کوفہ کے گورنر رہے۔ الکندی اپنے والد کے دور ولایت میں کوفہ میں تقریباً ۱۸۵ھ کے لگ بھگ پیدا ہوا۔ جب ہوش سنبھالا تو اس نے اپنے گرد علمی و سیاسی مجالس کو برپا پایا۔ الکندی نے ابتدائی تعلیم کوفہ ہی میں پائی۔ ان دنوں بصرہ اور کوفہ صرفی و نحوی موشگافیوں اور معتزلی عقائد کی بحثوں کی آماجگاہ بنے ہوئے تھے۔ کوفہ کی علمی درس گاہوں سے فراغت کے بعد

---

[1] ڈاکٹر میر ولی الدین تاریخ فلاسفۃ الاسلام

[2] تاریخ الحکمہ کا اردو ترجمہ حکمائے عالم ص ۴۷۶

[3] محمد عبدالہادی مقدمہ رسائل الکندی الفلسفیۃ ص ۱ قاہرہ ۱۳۶۹ھ - ۱۹۵۰ء

بصری مکاتب علم کی کشش اس وقت اسے بصرے لے گئی۔ جہاں اسے بصری علما سے استفادہ کا موقع ملا۔لیکن اس وقت بغداد جہاں سیاسی لحاظ سے مرکز تھا وہاں اس نے علمی مرکز کی حیثیت بھی اختیار کرلی تھی۔ یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب عباسی فرمانروا دنیا کے گوشے گوشے سے اہل علم کو بغداد میں جمع کر رہے تھے۔ مختلف فنون کی کتب بغداد میں لائی جارہی تھیں اور بغداد کی علمی مجالس مثالی بن گئی تھیں۔ تحقیق وجستجو کی تڑپ اور دوسری قوموں کے علوم کی حصول کی لگن نے الکندی کو بالآخر بغداد پہنچا دیا

الکندی کو بغداد میں مختلف زبانوں کے ساتھ ساتھ یونانی اور ہندی فلسفہ اور دیگر علوم کے مطالعہ کا موقع ملا۔ افتاد طبع متجسسانہ تھی ہی، جلد ہی اس کی پوشیدہ صلاحیتیں سب پر عیاں ہونے لگیں۔ اور علمی مجالس میں اس کی آواز بڑی توجہ سے سنی جانے لگی۔ رفتہ رفتہ علما کے حلقہ میں اس کا تبحر علمی مسلّم ہوگیا۔

دارالحکمت میں

المامون (۸۱۳-۳۳ء) نے الکندی کو دارالحکمۃ میں یونانی سائنس و فلسفہ کی کتب کے عربی مترجم کی حیثیت سے مقرر کیا یہ اس وقت بہت بڑا اعزاز خیال کیا جاتا تھا۔ دارالحکمۃ میں الکندی نے بڑی جانفشانی سے کام کیا۔ جس کے نتیجہ میں معتصم کے دورِ حکومت میں اسے شہزادہ احمد کا اتالیق اور شاہی طبیب خاص مقرر کر دیا گیا۔ یہ اس کے عروج کا دور ہے۔ اس کے علمی کارناموں کی ایک طویل فہرست علامہ ابن ابی اصیبعہ نے طبقات الاطبّا میں بیان کی ہے۔ کچھ کتابوں کا ذکر قفطی نے اخبار الحکما[1] میں بھی کیا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے اس کی کچھ کتب کے نام

---

[1] یہ کتاب "تاریخ الحکما" اور "اخبار الحکما" دونوں ناموں سے مشہور ہے قفطی نے کل ۲۲۶ کتابوں کے نام لکھے ہیں جو حسب ذیل موضوعات پر ہیں۔

کتب فلسفہ، کتب منطق، کتب حساب، کتب کریہ، کتب موسیقی، کتب نجوم، کتب ہندسہ، فلکیات، کتب طب، احکامیات، کتب جدل، نفسیات، سیاسیات، احداثیات البعادیات، تقدمیات، انواعیات،

(حکمائے عالم اردو ترجمہ تاریخ الحکماء)

تو ہم تک پہنچے ہیں لیکن اصل کتب مفقود ہوگئیں۔ مختلف علوم میں اس کے تراجم و تصانیف کا ذکر ابن ندیم نے اپنی کتاب الفہرست میں کیا ہے۔ جس کے مطابق ان کی تعداد دو سو اکتیس تک پہنچتی ہے۔ جن کی تفصیل وہ یوں بیان کرتا ہے۔

۱۔	فلسفہ	۲۲	۹۔	حساب	۱۱
۲۔	نجوم	۱۹	۱۰۔	ہندسہ	۲۳
۳۔	فلکیات	۱۶	۱۱۔	طب	۲۲
۴۔	جدل	۱۷	۱۲۔	سیاست	۱۲
۵۔	احداث	۱۴	۱۳۔	طبعیات	۳۳
۶۔	موسیقی	۷	۱۴۔	منطق	۹
۷۔	نفس	۵	۱۵۔	احکام	۱۰
۸	مبادی معرفت	۵	۱۶۔	ابعاد	۸
			۱۷۔	کریات	۸

الکندی کی جو کتب آج موجود ہیں، ان میں سب سے مشہور اس کے وہ رسائل ہیں جنہیں یکجا کر دیا گیا ہے۔ ایک رسالہ فلسفہ اور اس کی تعریف و غایت کے بارے میں ہے ایک دوسرے رسالہ میں اس نے نفس سے بحث کی ہے۔ کچھ رسائل میں مادہ اور کائنات کی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایک رسالہ میں وہ انسانی عقل پر گفتگو کرتا ہے۔ کہیں الٰہیات اور وحدانیت کے سلسلہ میں مستقل باب ہیں۔ کہیں طبیعات پر گفتگو ہے۔ غرض تقریباً بائیس رسائل پر مشتمل یہ مجموعہ الکندی کے علمی تبحر کا ایک نادر نمونہ ہے۔

معتصم کے بعد متوکل (۸۴۷ء۔ ۸۶۱ء) کے دور حکومت میں الکندی کو زوال آگیا۔ کہا جاتا ہے کہ متوکل چونکہ ذاتی طور پر معتزلہ معتقدات کے خلاف تھا۔ اس لئے اسے الکندی کے معتزلانہ خیالات اچھے نہ لگے۔ اور اس طرح خلیفہ وقت کی بے التفاتی اس کے زوال کا سبب بنی۔ لیکن کچھ لوگوں کا خیال یہ ہے کہ موسیٰ بن شاکر کے بیٹوں محمد اور احمد نے متوکل پر اپنا رنگ جمالیا تھا۔ اور وہ خلیفہ سے اس قدر قریب ہوگئے تھے کہ جس عالم کو وہ بااثر ہوتا دیکھتے

کہہ کر اسے اس کے منصب سے گروا دیتے۔

اس طرح امین، مامون، معتصم، واثق اور متوکل کے ادوار سلطنت کو اپنی چشم حقیقت بیں سے دیکھ کر دنیا کا یہ عظیم فلسفی تقریباً ۲۵۲ھ مطابق ۸۶۶ء کے لگ بھگ فوت ہوگیا۔[1]

ایک اور بیان کے مطابق دراصل متوکل ایک شکی مزاج حکمراں تھا۔ اس نے موسیٰ بن شاکر کے بیٹوں کے کہنے میں آکر کندی کو دربار سے نکلوا دیا۔ اور اس کا سارا ساز و سامان جس میں علمی کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ تھا۔ ضبط کر لیا۔ بعد میں مسند بن علی کی سفارش پر یعقوب کندی کی کتابیں تو اسے مل گئیں لیکن دربار سے اس کا تعلق قائم نہ ہوا۔ یہاں تک کہ ۸۶۱ء میں متوکل قتل ہوگیا۔ متوکل کے قتل کے بعد یعقوب کندی قریباً بارہ سال زندہ رہا، لیکن ایک دفعہ دربار سے نکلنے کے بعد وہ درباری زندگی سے ایسا دل برداشتہ ہوا کہ اس نے اپنی عمر کا باقی زمانہ گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر تصنیف و تالیف کے شغلے میں بسر کیا۔[2]

الکندی کا فلسفی مسلک

مسلمانوں کے ہاں شروع شروع میں یونانی فلسفہ سریانی تراجم اور ان کی شرحوں کے ذریعہ پہنچا۔ المامون کے عہد میں یونانی فلسفہ کی کتابوں کے براہ راست یونانی زبان سے ترجمے ہونے لگے اور اس طرح مسلمان اہل علم کا براہ راست یونانی فلسفہ سے تعارف ہوا۔ قدرتی بات تھی کہ اس کا مسلمان ذہن و فکر پر اثر پڑتا۔ چنانچہ اس کے ردّ عمل کے طور پر مسلمانوں کے ہاں فلسفی فکر کی باقاعدہ نشو و نما شروع ہوئی۔ اس سلسلے میں ان کا پہلا فلسفی ابو یوسف یعقوب الکندی تھا۔

الکندی کا وہ دور ہے، جب مسلمانوں میں نئے علوم کا بڑا چرچا ہو رہا تھا اور بیدار طبیعتیں اور فعّال ذہن ان کی طرف بڑے ذوق و شوق سے راغب تھے۔ اب ایک طرف تو علوم نقلیہ تھے، جن کا سکہ پہلے سے رواں تھا۔ اور دینی طبقے ان کے والہ و شیدا تھا۔ اور اس وقت تک علوم تفسیر و حدیث و فقہ کافی ترقی کر چکے تھے۔ اور دوسری طرف یہ علوم عقلیہ تھے

---

[1] محمد عبدالہادی مقدمہ رسائل الکندی الفلسفیۃ ص۵ قاہرہ

[2] نامور مسلم سائنس دان۔ از پروفیسر حمید عسکری

جن کی نئی نئی آمد لوگوں کی توجہ اپنی طرف کھینچ رہی تھی ظاہر ہے اس صورت حال میں قدیم و جدید میں ایک طرح کی ذہنی کش مکش کا ہونا قدرتی تھا۔ الکندی اسی دور کی پیداوار ہے اور اس کی یہ کوشش تھی کہ وہ اس کش مکش کو حتی الوسع دور کرے۔

اس دور میں ایک طرف تو مذہب اور فلسفہ کو دو متضاد اور متناقض چیزیں سمجھا جاتا تھا۔ جن میں کسی قسم کی تطبیق نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ جہاں علوم نقلیہ کو خالص دینی علوم سمجھا جاتا تھا، وہاں علوم عقلیہ کی تحصیل کو خالص دنیا داری قرار دیا جاتا جس کا کہ دین سے کوئی تعلق نہیں دوسری طرف علوم عقلیہ سے شغف رکھنے والوں میں مذہب کے بارے میں شکوک وشبہات پرورش پا رہے تھے۔ اور یہ عام خیال تھا کہ ان علوم کو حاصل کرنے والے مذہب سے بیگانہ ہو جاتے ہیں۔ الکندی اس صورت حال سے خوب واقف تھا۔ اور اس نے اسی سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کی۔ وہ مذہب اور فلسفہ کو ساتھ لے کر آگے چلتا ہے اور اس کے نزدیک مذہب و فلسفہ اپنی وحدانیتِ مقصد کے اعتبار سے ایک ہیں اور دونوں کی ایک ہی منزل ہے۔ الکندی کے اس نقطۂ نظر اور مسلک کی اس کی زندگی کے ایک واقعہ سے بڑی اچھی وضاحت ہوتی ہے۔

بلخ کا ایک قدامت پسند فقیہہ محض اس وجہ سے کہ یعقوب کندی سائنس اور فلسفہ کی اشاعت کرتا رہتا ہے، اس کا سخت مخالف ہو گیا۔ کیونکہ وہ سائنس اور فلسفے کو اپنی دانست میں مذہب کے خلاف سمجھتا تھا اس نے پہلے تو وعظ کے ذریعہ عوام کو یعقوب کندی کے خلاف بھڑکانے کی کوشش کی۔ اس کے بعد وہ اپنے چند ہم خیال شاگردوں کو لے کر بغداد روانہ ہو گیا۔ تاکہ اگر موقع مل جائے تو کندی پر حملہ کر کے اسے قتل کر دے۔ کندی کو بعض ذرائع سے بلخی فقیہہ کے اس منصوبے کا علم ہو گیا۔ یہ مامون الرشید کا زمانہ خلافت تھا۔ جس میں بغداد کے گلی کوچوں میں سائنس اور فلسفے کے چرچے تھے۔ خود خلیفۂ وقت ان علوم کے سرپرست تھا۔ اور دیگر علماء کے ساتھ کندی کو بھی اس کے علم وفضل کے باعث بہت عزیز رکھتا تھا۔ اس لئے کندی اس موقع پر مامون رشید سے شکایت کر کے بلخی فقیہہ کو بڑی آسانی سے گرفتار کرا سکتا تھا۔ لیکن اس نے یہ طریقہ اختیار کرنے کی بجائے اس فقیہہ کو اپنے گھر میں دعوت دی، اور دلائل سے اسے سمجھایا کہ فلسفہ اور سائنس اسلام کے مخالف نہیں ہیں۔ اس کا بلخی فقیہہ پر اتنا اثر ہوا کہ اس نے خود بھی ریاضی اور ہیئت کا علم

حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس مقصد کے لئے وہ کچھ مدت یعقوب کندی کے حلقۂ درس میں داخل رہا۔ لیکن ان علوم کے ساتھ اسے طبعی مناسبت نہ تھی۔ اس لئے ان کے حصول میں وہ کوئی کامیابی حاصل نہ کر سکا۔ البتہ اتنا ضرور ہوا کہ سائنس اور فلسفہ کے بارے میں اس کے شکوک رفع ہو گئے۔ چنانچہ وہ جو بغداد میں کندی کا جانی دشمن بن کر آیا تھا، بغداد سے کندی کا ایک جگری دوست بنکر بلخ کو روانہ ہوا۔ بلخ کے اس فقیہہ کا نام ابو معشر جعفر بن محمد تھا[1]

فلسفہ کی تعریفات

الکندی فلسفی کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے:-

"لأن غرض الفیلسوف فی علمه اصابة الحق وفی عمله العمل بالحق"

فلسفی کا مقصد علمی لحاظ سے حق کو پانا اور عملی طور پر اس حق پر عمل پیرا ہونا ہے۔ (الفلسفۃ الاولیٰ ص۹)

انسان کے اندر تلاش و جستجو کا جو رجحان ہے، اس کا ذکر کرتے ہوئے الکندی لکھتا ہے۔ یہ انسان کا فطری عمل ہے۔ ہر نئی چیز اسے بھاتی ہے اور ہر شے کی کنہ معلوم کرنے کی تشنگی اسے تحقیقات کے لامتناہی سمندر میں اِدھر اُدھر لئے پھرتی ہے، جہاں سے وہ قسم قسم کی سیپیاں اور موتی جمع کر کے خلق خدا تک پہنچاتا ہے۔ انسان ہر نئی چیز کے بارے میں چار بنیادی باتیں جاننا چاہتا ہے جن کا اظہار ہمیشہ وہ چار سوالوں کی شکل میں کرتا ہے اور وہ ہیں هَلْ ؟ (کیا) مَا؟ (کیوں)، اَیّ ؛ (کیسے) لِم ؟ (کس لئے) ان سوالوں سے اس کی مراد اشیاء کی انیت، ماہیت، تمیز اور غایت معلوم کرنا ہوتی ہے۔ چنانچہ الکندی انسان کے انہی سوالات کو مطالب علمیہ کا نام دیکر انہیں سائنس و فلسفہ کی بنیاد قرار دیتا ہے[2]

الکندی کے نزدیک انسان کو ان مطالب علمیہ کی تحصیل ہی فلسفہ کی طرف لے جاتی ہے۔ جہاں وہ بسا اوقات یا تو کسی ایسی چیز کو جو محض اس کی راہ میں تحقیق کے دوران آئی تھی حتمی خیال کرنے لگتا ہے یا پھر مقصدیت سے کچھ ہٹ کر مختلف وادیوں میں بھٹکنے لگتا ہے۔ مذہب ہی وہ واحد ساتھی ہے

---

[1] نامور مسلم سائنس داں۔ از پروفیسر حمید عسکری ص۲۶۷

[2] رسائل ج۔ ۱ ص۱۰۱، قاهره ۱۹۵۰

جو ایسی حالت میں اس کی مدد کرتا ہے اور پھر اسے مقصدیت کی شاہراہ پر لا کھڑا کرتا ہے۔ اپنے رسالہ فی حدود الاشیاء درسومھا" میں فلسفہ کی وہ مندرجہ ذیل تعریفیں کرتا ہے۔

فلسفہ کی پہلی تعریف تو یونانی لفظ "فیلسوف" سے ماخوذ ہے۔ جو دو الفاظ "فلا" یعنی محب اور دوست اور "سوفا" یعنی حکمت ودانش سے مرکب ہے۔ لہٰذا فلسفہ کی یہ عام تعریف جسے ارسطو نے بیان کیا تھا یہ ہے کہ فلسفہ نام ہے حکمت کا۔ اس کے نزدیک فلسفہ کی دوسری تعریف یہ ہے أن الفلسفۃ ھی التشبہ بافعال اللہ تعالی لقدر طاقۃ الانسان" اپنی طاقت کے مطابق افعال اللہ سے انسان کی شابہت فلسفہ ہے۔

یہ وہ تعریف ہے جسے بعد میں فارابی نے بھی اپنایا

فلسفہ کی تیسری تعریف الکندی یہ کرتا ہے۔ "الفلسفۃ عنایۃ بالموت" فلسفہ موت سے اہتمام رکھنے کا نام ہے۔ اسی تعریف کو بعد میں بوعلی ابن سینا نے اپنایا اور اسے وہ افلاطون کی تعریف لکھتا ہے[۱]

فلسفہ کی چوتھی تعریف وہ ہے جو پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی میں عام طور پر کی جاتی تھی۔ اور وہ یہ ہے۔ "الفلسفۃ صناعۃ الصاعات وحکمۃ الحکمۃ" فلسفہ علموں کا علم اور حکمتوں کی حکمت ہے

پانچویں تعریف یہ ہے کہ :- الفلسفۃ معرفۃ الانسان نفسہٗ"

فلسفہ انسان کے اپنے نفس کی پہچان کا نام ہے۔ فلسفہ کی یہ تعریف سقراط وغیرہ نے بھی کی تھی۔

فلسفہ کی چھٹی تعریف یہ ہے کہ :- "أن الفلسفۃ علم الاشیاء الابدایۃ الکلیۃ انتیانھا وماھیتھا وعللھا لقدر طاقۃ الانسان"

فلسفہ انسانی طاقت کے اشیاء ابدانیہ کلیہ کی انیت، ماہیت اور علت وغیرہ کو جاننے کا نام ہے

الکندی ان تعریفات میں جیسی آخری دو تعریفوں کا قائل نظر آتا ہے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ وہ مذہبی معتقدات کو بھی اتنا ہی ضروری خیال کرتا ہے جتنا مسلمہ کلیات کو۔ کیونکہ اس کے

---

[۱] رسالۃ ابن سینا "دفع الغم من الموت" ص۵۲ لزبن ۱۸۹۹ء

نزدیک انسانی عقل و تجربہ وحی کے مقابلہ میں حتمی نہیں ہیں۔ انسانی عقل پر اس نے ایک رسالہ لکھا ہے۔ جس میں وہ عقل کی مختلف اقسام۔ عقل ھیولانی، عقل فاعل، عقل مستفاد، عقل منفعل اور عقل بالملکہ وغیرہ پر بحث کرکے یہ ثابت کرتا ہے کہ حقائق الاشیاء اور معلومات کلیہ صرف عقل ہی سے حاصل نہیں کی جاسکتیں[1] اس کے لئے وحی کا سہارا لینا انسان کے لئے ضروری ہو جاتا ہے۔

الکندی فلسفہ کو تین بڑی شاخوں میں تقسیم کرتا ہے[2]

۱۔ جوھریات

۲۔ جسمانیات یا طبعیات

۳۔ ربوبیات

علوم فلسفہ کو ان تین شاخوں میں تقسیم کرنے کی بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ وہ انسانی معلومات کے تین ماخذ قرار دیتا ہے۔ پہلی قسم کی معلومات تو وہ ہیں جنہیں ہم حِس کے ذریعہ معلوم کرتے ہیں۔ ہمارے جملہ حواس جن اشیاء کا جائزہ لے سکتے ہیں، انہیں غلطی سے ہم اپنا علم کلی سمجھنے لگتے ہیں۔ حالانکہ وہ علم کی بالکل سطحی اور ابتدائی صورت ہوتی ہے کیونکہ حواس کے علاوہ اس کرۂ ارض پر ایسی سیکڑوں اشیاء موجود ہیں جنہیں ہم صرف محسوس تو کرسکتے ہیں لیکن ان کی ہیولانی صورت کا تعین ہرگز نہیں کرسکتے۔ اس کے ساتھ ہی ہم انہیں ہیولانی کیفیتوں سے جدا بھی نہیں کرسکتے۔ چنانچہ اس قسم (محسوسات) کا علم پہلے علم کے مقابلہ میں زیادہ اہم و برتر ہے۔ لیکن اس پر اکتفا کر بیٹھنا بھی غیر منطقی اور انصاف کے خلاف ہوگا۔ محسوسات کی سرحدیں ایک ایسے علم سے جاملتی ہیں جہاں سے حقائق الاشیائ کے علم کی ابتدا ہوتی ہے چنانچہ اس علم کو وہ علم الربوبیت کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ الکندی کے نزدیک علوم طبعیات سب سے کم درجہ کے علوم اور علوم جوہریات علوم متوسط اور علوم ربوبیہ اعلیٰ ترین علوم خیال کئے گئے ہیں۔ اور غالباً اس درجہ بندی کی بڑی وجہ یہ بھی ہو کہ وہ پوری کائنات کو تین حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔

---

[1] رسائل الکندیہ الفلسفیہ رسالہ فی العقل ص ۳۵۵۔ قاہرہ ۱۹۵۰ء

[2] ابن نباتہ شرح العیون

۱۔ مادہ۔

حواس خمسہ سے پرکھی جانے والی اشیاء

۲۔ ملابستہ للمادہ۔

وہ اشیا جو جوہر مادہ نہیں ہیں لیکن اس سے متعلق ضرور ہوتی ہیں جیسے نفس اور نسمہ وغیرہ۔

۳۔ غیر مادی

غیر مادی اشیاء میں جہاں وہ الٰہیات کا ذکر کرتا ہے وہاں اس سے اس کی مراد خدائے واحد ہرگز نہیں ہوتی اس کے نزدیک الٰہیات اور وحدانیت دو الگ چیزیں ہیں اس لئے وہ جب بھی ذات باری تعالیٰ پر گفتگو کرتا ہے تو اسے وحدانیت کے مسئلہ میں شمار کرتا ہے الکندی نفس پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

نفس ایک لبیط روحانی جوہر ہے۔ اس کی حقیقت ربانی ہے۔ خدا سے اس کا صدور اس طرح ہوا ہے، جس طرح کہ سورج سے روشنی نکلتی ہے[1] نفس مادی جسم سے نہ صرف کلیتہً مختلف ہے، بلکہ متضاد بھی ہے۔ اس کی ایک نمایاں وجہ یہ بھی ہے کہ نفس جسم کی خواہشات پر پابندی اور قیود عائد کرتا ہے[2] اس تاریک دنیا میں نفس جب جسم سے متصل ہوتا ہے تو جسم کی ضروریات اور خواہشات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ اس تاثر کے نتیجہ میں عقل کے علاوہ شہوت اور غضب کی قوتیں پیدا ہوتی ہیں۔ عقل، شہوت اور غضب کو بادشاہ خنزیر اور کتے سے بالترتیب تشبیہ دی جاسکتی ہے[3] انسان فضیلت کی تحصیل اس وقت کرتا ہے جب کہ عقل کی حکمرانی بقیہ دونوں قوتوں پر مکمل ہوتی ہے انسان کا آخری کمال تفکر

---

[1] رسائل الکندی الفلسفیۃ (۱۹۵۰) (۱: ۲۷۳) شائع کردہ ابوریدہ مطبعۃ الاعتماد۔ مصر

[2] ایضاً: ۲۷۳

[3] ایضاً: ۲۷۴

ہیں ہے۔ جس کا موضوع اعلیٰ خدا کی ذات ہے، خدا کا حقیقی علم صرف اس نفس کو حاصل ہوسکتا ہے، جو آلائشوں سے پاک ہو۔ اخلاق فلسفیانہ کمال کے لئے ناگزیر شرط اور ذریعہ ہے کمال کا انتہائی درجہ اس وقت حاصل ہوگا جب کہ روح جسم سے الگ ہوکر عالم روحانی میں داخل ہو جائے گی۔ جہاں اسے خدا کا دیدار ہوگا[1] یہ کمال انسانی کی معراج ہے۔ یہاں پہنچ کر انسان پر سارے حقائق اس طرح منکشف ہوں گے، جیسے کہ وہ علم الٰہی میں ہیں[2] حقائق روحانیہ کا یہ انکشاف انتہائی مسرت انگیز ہوگا[3]"

الکندی کی علمی شخصیت کتنی جامع تھی، اس کا اندازہ اس کی ان کثیر التعداد تصانیف سے ہو سکتا ہے، جو اس نے علوم نقلیہ کو چھوڑ کر اپنے زمانے کے ہر علم پر لکھیں۔ اس کے زمانے میں یونان و فارس و ہند سے جو بھی علوم مسلمانوں میں منتقل ہوئے، اس نے ان سب سے استفادہ کیا۔ القفطی الکندی کی اس خصوصیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

مشتھرٌ فی الملۃ الاسلامیۃ بالتبحر فی فنون الحکمۃ الیونانیۃ والفارسیۃ والھندیۃ، متخصص باحکام النجوم واحکام سائر العلوم۔ وہ ملت اسلامیہ میں یونانی فارسی و ہندی حکمت کے مختلف فنون میں اپنے تبحر علمی کی وجہ سے مشہور ہے اور وہ علم نجوم اور دوسرے علوم کے امور کا ماہر ہے۔

قفطی نے الکندی کے متعلق ابن جلجل کا یہ قول نقل کیا ہے:۔ بصرے سے بغداد میں حصول علم کے لئے گیا اور رفتہ رفتہ طب، فلسفہ، حساب، منطق، موسیقی، ہندسہ، علم الاعداد و ہیئت میں یگانہ روزگار بن گیا۔ علم کی بدولت بادشاہوں کا ندیم بنا کتب فلسفہ

---

[1] ایضاً: ۲۷۴، ۲۷۶

[2] " : ۲۸۵، ۲۷۶

[3] " : ۶۷۷

یہ اقتباس مجلہ علوم اسلامیہ علی گڑھ (جون ۱۹۶۳ء) میں شائع شدہ مضمون بعنوان ابتدائے اسلام میں اخلاقی فکر کا ارتقاء از ڈاکٹر محمد عبدالحق انصاری سے ہے۔

کی ایک کثیر تعداد عربی میں منتقل کر کے ان کی مشکلات دور کیں۔ اہل منطق کے رنگ میں توحید و نبوت پر بے نظیر کتابیں لکھیں۔ ایک کتاب آداب نفس پر لکھی جس کا نام تسہیل سبل الفضائل ہے۔ اقالیم معمورہ پر بھی ایک کتاب لکھی ...[1]

الکندی کی یہ خصوصیات تھیں، جن کی بناء پر اسے فیلسوف العرب کہا گیا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ وہ اس لقب کا بجا طور سے پوری طرح مستحق تھا۔

---

[1] حکمائے عالم اردو ترجمہ تاریخ الحکماء۔ ص۸۷

انبیاء کے نزدیک اس ذات واجب الوجود کو دیکھنے اور سننے کا تعلق ضرور پیدا ہوتا ہے اور دراصل نبوت کا مطلب بھی یہی ہے کہ نبی نے خدا کی کوئی بات سنی اور پھر انبیاء اپنے پیروؤں کو اس بات کا یقین بھی دلاتے ہیں کہ اگر کوئی شخص ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلے۔ اور ان کے طریقہ پر اپنی ذات کی تکمیل کرے تو وہ اللہ تعالے کو دیکھ بھی سکتا ہے۔ الغرض ایک طرف تو آرین اقوام کی حکمت کا یہ تصور ہے کہ واجب الوجود جسم سے اتنا مجرد اور منزہ ہے کہ انسانی حواس اس سے کوئی تعلق رکھ نہیں سکتے" تو دوسری طرف انبیاء علیہم السلام کا یہ کہنا ہے کہ واجب الوجود کی بات سنی جا سکتی ہے اور اس ذات اقدس کو دیکھا بھی جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے آرین فکر اور حنیفی طریقہ میں یہ اختلاف موجود ہے اب اگر آریائی ذہن کو نبوت کی بات سمجھانی مقصود ہے، اور اسے اگر واقعی حنیفی طریقہ کا اس طرح قائل کرنا ہے کہ اسکی طبیعت از خود نبوت کو ماننے کے لئے آمادہ ہو جائے تو اس امر کی ضرورت ہوگی کہ آرین فکر اور حنیفی طریقہ میں جو اختلاف بتایا جاتا ہے اسے رفع کیا جائے اور دونوں میں مطابقت پیدا کی جائے۔ شاہ ولی اللہ صاحب کے تصوف کا کمال یہ ہے کہ وہ مسئلہ "تجلی" کے ذریعہ سمجھا دیتے ہیں کہ انسان کس طرح واجب الوجود کی جو جسم سے منزہ اور مجرد ہے، بات سن سکتا اور اسے دیکھ سکتا ہے۔

(مولانا عبید اللہ سندھی)